تدوینِ قرآن بعہد صدیقی کے منہج کا تحقیقی جائزہ۔۔۔۱

حافظ محمد عبدالقیوم*

عہد نبوی میں قرآن کریم کی بذریعہ حفظ وکتابت ہر دو لحاظ سے حفاظت کی جارہی تھی۔اس طرح نبی کریم ﷺ (م۔۱۱ھ/ ۶۳۲ء) کی زندگی میں قرآن کریم تحریری طور پر موجود تھا، مگر نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی حیثیت صحف موسوی یعنی تورات جیسی نہ تھی کہ ایک ہی مرتبہ الواح کی شکل میں نبی کریم کو دے دیا گیا ہو۔لیکن یہاں صورت حال مختلف رہی، قرآن کریم نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔نزول کی اس کیفیت کی وجہ سے قرآن کا اختتام نبی کریم ﷺ کی رحلت سے منسلک ہو کر رہ گیا تھا۔اس لیے جب تک نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس اس دار فانی میں موجود تھی، نزولِ وحی کا امکان بھی یقیناً موجود تھا، اور پھر نزول وحی کے امکان کی وجہ سے نسخ کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس لیے اس بات میں تو کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ عہد نبوی میں قرآن کریم تحریری صورت میں موجود تھا جس پر قرآن واحادیث نبویہ اور ان میں ادوات کتابت کا ذکر شاہد ہیں۔

حارث محاسبی (م۔۲۴۳ھ/۸۵۷ء) عہد نبوی میں قرآن کریم کی حالت کو اپنے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ عہد صدیقی میں قرآن کریم کا لکھنا کوئی نیا کام نہیں تھا یہ تو نبی کریم ﷺ کے عہد اور ان کے حکم سے لکھا جارہا تھا مگر پارچوں اور شانے کی ہڈیوں وغیرہ پر تحریری طور پر متفرق صورت میں تھا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ (م۔۱۳ھ/۶۳۴ء) نے ان کو یکجا کر دیا تو گویا کہ یہ ایسا ہوا کہ قرآن کے اوراق جو نبی کریم ﷺ کے حجرہ مبارک میں منتشر صورت میں تھے ان کو جمع کرنے والے نے ایک ڈورے میں باندھ دیا تاکہ ان میں سے کوئی شے ضائع نہ ہو جائے:

> ”كتابة القرآن ليست بمحدثة، فانه كان يأمر بكتابته ولكنه كان مفرقاً في الرقاع والأكتاف، والعسب، وانما أمر الصديق بنسخها من كان الى مكان مجتمعاً، وكان ذلك بمنزلة أوراق وجدت في بيت رسول الله ﷺ فيها القرآن منتشر فجمعها جامع وربطها بخيط حتى لا يضيع منها شيئ.“ (۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی (م۔۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء) لکھتے ہیں کہ ایک طرف تو حضرت علیؓ (م۔۴۰ھ/۶۶۱ء) کا یہ قول ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے پہلی مرتبہ قرآن کریم جمع کیا یعنی ضبط تحریر میں لائے اور دوسری طرف نبی کریم ﷺ سے مروی یہ روایت ملتی ہے کہ مجھ سے قرآن کریم کے علاوہ کچھ مت تحریر کرو۔ بظاہر ان دو اقوال میں تعارض دکھائی دے رہا ہے مگر حقیقت یہ نہیں کیوں کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ٹھہرتی ہیں۔عہد نبوی میں اگرچہ قرآن کریم مکمل طور پر لکھا گیا تھا لیکن کسی

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

ایک جگہ جمع نہیں تھا اور نہ سورتیں مرتب صورت میں تھیں اور پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کو ایک جگہ جمع یعنی مدون کر دیا:

"سمعت علیاً یقول : أعظم الناس فی المصاحف أجراً أبوبکر ، رحمة الله علیٰ أبی بکر، هو أول من جمع کتاب الله". لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن"فلا ینافی ذلک، لأن الکلام فی کتابة مخصوصة علیٰ مخصوصة ، وقد کان القرآن کله کتب فی عهد النبی ﷺ لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور."(۲)

علامہ جلال الدین سیوطی (م۔۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) عہد نبوی میں قرآن کریم کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پورا قرآن کریم نبی کریم ﷺ کے عہد میں لکھا گیا تھا، لیکن وہ ایک جگہ جمع نہیں تھا اور سورتیں مرتب صورت میں نہیں تھیں:

"قد کان القرآن کتب کله فی عهد رسول الله ﷺ لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور."(۳)

عہد نبوی میں کاغذ کی عدم دستیابی کو قرآن کریم کی تدوین نہ ہونے کی جو وجہ قرار دیا جاتا ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ قرآن کریم کے مدوّن نہ ہونے کی وجہ دراصل خود نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کی موجودگی ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی نزول وحی اور اس کے نسخ کے امکان پر دلالت کرتی ہے۔ علامہ ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی (م۔۳۸۸ھ)، ابوشامہ اور دیگر علماء نے عہد نبوی میں قرآن کریم کے مدون نہ ہونے کی یہی وجہ قرار دی ہے۔ اس وجہ کو حافظ ابن حجر نے بھی تسلیم کیا ہے اور اس مسئلہ میں علامہ خطابی کی تائید ہے:

"وقال الخطابی وغیره: یحتمل أن یکون ﷺ انما لم یجمع القرآن فی المصحف لما کان یترقبه من ورود ناسخ لبعض أحکامه أو تلاوته فلما انقضیٰ نزوله بوفاة ﷺ ألهم الله الخلفاء الراشدین ذلک وفاء لوعد الصادق بضمان حفظه علیٰ هذه الأمة المحمدیة زادها الله شرفاً ."(۴)

نبی کریم ﷺ کے رحلت فرمانے کے بعد اکابر صحابہ کرام ہی دین کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ اگر چہ شرف صحابیت کے مرتبہ میں اکابر و صغار صحابہ کرام باہم مساوی ہو سکتے ہیں مگر دین کی حفاظت و آگاہی اور اس کی ذمہ داری میں یقیناً اکابر صحابہ کرام بڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح یہ طبقۂ اکابر قرآن کی عرضۂ اخیرہ کے مطابق قرآنیت کی حقیقت سے زیادہ آگاہ تھا۔ کیوں کہ اگر چہ قرآن کریم تحریری صورت میں موجود تھا مگر نسخ قرآن، قراءات قرآن، ترتیبِ آیاتِ قرآن اور عرضۂ اخیرہ (نبی کریم ﷺ حضرت جبرئیل سے نازل شدہ قرآن ہر سال ماہ رمضان المبارک میں سنا کرتے تھے اور سنایا کرتے تھے، جس سال نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی اس سال رمضان المبارک میں دو مرتبہ قرآن کریم کا دَور کیا گیا) سے تو یہی طبقہ آگاہ تھا،

جس طرح حضرت زید بن ثابتؓ عرضہ اخیرہ میں موجود رہے جو اکابر میں سے تھے۔ اس طرح عہد صدیقی میں قرآن کی قرآنیت اکابر صحابہ کرام ہی سے منسلک ہو کر رہ گئی تھی۔ حضرت عمر دراصل اکابر صحابہ کرام کے اس امتیازی وصف میں عمومیت لانا چاہتے تھے، کہ قرآن کی قرآنیت جو اُن سے منسلک ہو کر رہ گئی تھی، انہی اکابر صحابہ کرام کی موجودگی میں عرضہ اخیرہ کے مطابق نسخہ تیار ہو سکے۔ قرآن تو پہلے رقاع، لخاف اور رق وغیرہ میں تحریری طور پر موجود تھا مگر عرضہ اخیرہ کے مطابق مدون نہیں تھا۔ چناں چہ جب جنگ یمامہ میں اکابر صحابہ کرام کی شہادت میں کثرت ہونے لگی تو حضرت عمر فاروقؓ کے دل میں انہی خدشات نے جنم لیا کہ اسی طرح اگر اکابر قراء صحابہ کرام اس دار فانی سے کوچ کرتے رہے تو قرآن تحریری صورت میں ہونے کے باوجود ''عدم تواتر'' کا شکار ہو کر رہ جائے گا کہ اس میں منسوخ شدہ اور عرضہ اخیرہ میں فرق و امتیاز نہیں رہے گا۔ وحی کا نزول تو تیس برس سے ہو رہا تھا مگر آیات منسوخ ہوتی رہیں اس لیے اس کثرت نزول وحی کو اگر کلی طور پر ضبط تحریر میں لایا جاتا تو عہدِ صدیقی میں مدون ہونے والے یعنی موجودہ قرآن سے یقیناً کئی گنا زیادہ ہوتا اور اس طرح اس میں حفظ اور تواتر کا قائم رکھنا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا۔

اس لحاظ سے حضرت عمرؓ کے خدشات مکتوب صورت میں نہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ قرآن میں عدم تواتر کی وجہ سے تھے۔ اس طرح عہد صدیقی میں قرآن کریم کی تدوین دراصل قرآن میں تواتر کو قائم رکھنے کے انتظامات اور اس میں تسلسل کی داستان ہے۔

روایت تدوین قرآن:

ذیل میں صحیح بخاری سے جمع و تدوین قرآن سے متعلق روایت نقل کی جاتی ہے:

''حدثنا موسى بن اسماعيل عن ابراهيم بن سعد حدثنا ابن شهاب عن عبيد بن السباق: أن زيد بن ثابتؓ، قال : أرسل اليَّ أبو بكرٍ مَقْتَلَ أهلِ اليَمَامَةِ ، فاذا عُمَرَ بْنُ الخطّاب عنده، قال أبو بكرٍ: ان عمرؓ أتاني، فقال: ان القتل قد استحر يوم اليمامة بقراء القرآن، وانّي أخشى أن يستحرَّ بالقرّاء بالمواطن ،فيذهبُ كثيرٌ من القرآن، وانى أرى أن تأمر بجمع القرآن. قلت لعمر: كيف تفعل شيئًا لم يَفْعَلْه رسولُ الله ﷺ ،قال عمر: هذا والله خيرٌ، فلم يزل عمر يراجعنى، حتى شرح الله صدرى لذلک، ورأيت فى ذلک الذى رأى عمرؓ .قال زيد: قال أبو بكر، انک رجل شآبٌ، عاقل، لانتهمک، وقد كنت تكتب الوحى لرسول الله ﷺ، فَتَتَبَّعِ القرآن فأجْمَعْه . فوَاللهِ لو كلَّفونى نَقْلَ جَبَلٍ مِن الجبالِ ما كان أثقل عليَّ مما أمرنى به من

جمع القرآن، قلت: كيف تفعلون شيئًا لم يَفْعَلْه رسولُ اللهﷺ ،قال: هو واللهِ خيرٌ،فلم يَزَلْ أبو بكرٍ يُراجِعُنِي حتّى شرح الله صدري للذي شَرَحَ له صدرَ أبي بكرٍ وعُمَرَ، فَتَتَبَّعْتُ القرآن أجْمَعُه من العُسُبِ واللِّخافِ وصُدُورِ الرِّجال، حتّى وجدتُ آخرَسُوْرَةِ التَّوبة مع أبي خزيمة الأنصاري، لم أجِدْها مع أَحدٍ غَيْرَهُ ﴿لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ حتّى خاتمةِ برآءةٍ فكانتِ الصُحُفُ عند أبي بكرٍؓ حتى توفّاه الله ثُمّ عند عُمَرَ حياتَهُ ثم عند حفصةَ بنتِ عُمَرَرضي الله.''(۵)

''ہم نے موسیٰ بن اسماعیل سے بیان کیا ہے، انہوں نے ابراہیم بن سعد سے، کہا ہم سے ابن شہاب نے بیان کیا، انہوں نے عبید بن سباق سے، انہوں نے زید بن ثابتؓ سے انہوں نے کہا جب یمامہ کی لڑائی میں (جو مسیلمہ کذاب سے ہوئی تھی) مسلمان مارے گئے (سات سو صحابہؓ شہید ہوئے) تو ابو بکر صدیقؓ نے مجھ کو بلوا بھیجا، میں گیا تو دیکھا حضرت عمرؓ بھی وہاں بیٹھے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے کہا! عمرؓ میرے پاس آئے اور کہنے لگے یمامہ کی لڑائی میں قرآن کے قاری بہت مارے گئے ہیں ڈرتا ہوں ایسا نہ ہو اسی طرح لڑائیوں میں قاری مارے جائیں اور بہت سا قرآن ہاتھ سے جاتا رہے تو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ قرآن کو اکٹھا کرنے کا حکم دے دیجیے۔ اس وقت میں نے عمرؓ سے کہا یہ تو بتلاؤ! کہ جو کام آنحضرتﷺ نے نہیں کیا (قرآن کا ایک مصحف میں جمع کرنا) وہ تم کیسے کرو گے؟ حضرت عمرؓ نے کہا (گو یہ کام آنحضرتﷺ نے نہیں کیا) خدا کی قسم یہ کام بہتر ہے (اس میں بڑی مصلحت ہے) پھر حضرت عمرؓ برابر مجھ سے اس کام کے لیے کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ بھی کھول دیا۔ مجھ کو بھی یہ کام مناسب نظر آیا، اور عمرؓ کی جو رائے تھی، وہی رائے میری بھی قرار پائی۔ حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں ابوبکرؓ نے کہا تو ایک جوان عقلمند آدمی ہے ہم کو تیرا اعتبار بھی ہے اور تو آنحضرتﷺ کے زمانہ میں وحی بھی لکھا کرتا تھا (قرآن سے خوب وقف ہے) ایسا کر قرآن کی تلاش کر اس کو اکٹھا کر، حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں خدا کی قسم اگر یہ لوگ مجھ سے ایک چٹان اٹھانے کا کہتے تو مجھ پر اتنا سخت نہ ہوتا جتنا یہ کہ کام مشکل ہوا، یعنی قرآن کو جمع کرنا۔ میں نے اُن سے کہا: تم لوگ وہ کام کیونکر کرو گے جو نبی کریمﷺ نے نہیں کیا؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ اگرچہ نبی کریمﷺ نے یہ کام نہیں کیا، مگر خدا کی قسم! یہ کام اچھا ہے اور برابر مجھ سے یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے جیسے

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی، میرے بھی دل میں ڈال دی (میں بھی ان کی رائے سے متفق ہوگیا)۔ میں نے قرآن کی تلاش شروع کی۔ کہیں کھجور کی چھڑیوں پر کہیں باریک پتلے پتھروں پر (یا ٹھیکروں پر) لکھا پایا، کچھ لوگوں کو زبانی یاد تھا (غرض اسی طرح سے جا بجا جمع کیا) یہاں تک کہ میں نے سورۃ توبہ کی آخری آیات ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (سورۃ توبہ کے اختتام تک) صرف رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت ابوخزیمہ انصاری کے پاس لکھی ہوئی پائیں۔ پھر یہ صحف (جو حضرت زید بن ثابتؓ نے مرتب کیا) حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات تک اُن کے پاس رہا اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس اور آپ کی وفات کے بعد اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس تھا (حضرت عثمان غنیؓ نے ان کو منگوا کر اُسکی نقلیں تیار کروا کر تمام ملکوں میں بھیجیں)۔"(۶)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت (۱۱ھ تا ۱۳ھ۔ ۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) میں قرآن کریم کی جو تدوین عمل میں آئی اس سے متعلق کتب تاریخ و حدیث میں کثیر روایات نقل کی گئی ہیں۔ محققین کے نزدیک اس سے متعلق روایات حدِ تواترِ معنوی کو پہنچی ہوئی ہیں۔ حافظ ابوعمر و یوسف بن عبداللہ (م۔ ۴۶۳ھ) جو ابن عبدالبر قرطبی کے نام سے معروف ہیں، لکھتے ہیں:

"وكان ابو بكر الصديق قد أمره بجمع القرآن في الصحف ، والأخبار بذلك متواترة المعنى وان اختلفت ألفاظها"۔(۷)

حضرت عمرؓ (م۔ ۲۴ھ/۶۴۴ء) کی تجویز پر غور و تامل کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جو تدوینِ قرآن کا حکم دیا، اس میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کس طرح قرآن مدون کروانا چاہتے تھے۔ آیا ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ابتدائے وحی سے لے کر وفاتِ نبوی تک جتنا قرآن نازل ہو چکا تھا اس کو مدوّن کیا جائے؟ یا وہ چاہتے تھے کہ عرضہِ اخیرہ کے مطابق قرآن مجید کو مدون کیا جائے؟ لازمی بات ہے کہ شیخین (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے مدنظر دوسری بات تھی کہ عرضہِ اخیرہ کے مطابق مدون کروایا جائے کیونکہ لفظ "قرآن" کا اطلاق اسی پر ہوگا جو عرضہِ اخیرہ کے مطابق ہوگا بقیہ حصہِ منسوخ ہو چکا تھا جو یقیناً نبوی ہدایات و تعلیمات کے مطابق تھا۔

۱۔ عرضہِ اخیرہ سے قبل نبی کریم ﷺ رمضان المبارک میں جب حضرت جبرئیل سے معارضہ کرتے تھے تو صرف حضرت زیدؓ (م۔) موجود ہوتے تھے مگر عرضہ اخیرہ میں حضرت زیدؓ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (م۔) بھی موجود تھے۔ جیسا کہ ابوبکر عبداللہ بن ابی شیبہ (م۔ ۲۳۵ھ/۸۵۰ء) روایت نقل کرتے ہیں:

"عن ابن عباس: أن رسول الله ﷺ كان يعرض القرآن فى كل رمضان مرة إلا العام الذى قبض فيه فانه عرض عليه مرتين بحضرة عبدالله بن مسعود فشهد مانسخ منه ومابدل". (۸)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ (م۔ ۶۸ھ/۶۸۸ء) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر رمضان میں ایک مرتبہ حضرت جبرئیلؑ کو قرآن سنایا کرتے تھے اور جس سال آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے حضرت جبرئیلؑ کو دو مرتبہ قرآن مجید سنایا جبکہ اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی موجود تھے۔ چنانچہ جو حصہ قرآن مجید میں سے منسوخ ہوا اور جو تبدیل ہوا اس سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی آگاہ تھے۔

۲۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت قرآن مجید اپنی مکمل تحریری صورت میں مختلف چیزوں مثلاً اونٹ کے شانہ کی ہڈیوں، کھجور کی شاخ کے ڈنٹھلوں، پتھر کی تختیوں اور دباغت شدہ چمڑہ قسم کی اشیاء پر لکھا ہوا موجود تھا، اور حضرت زیدؓ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں مختلف اوقات میں نازل شدہ آیات کو ان کے مقام ومحل پر رکھتے تھے۔ مگر قرآن کریم جن ٹکڑوں اور حصوں پر لکھا ہوا تھا وہ تعداد میں ایک یا دو نہیں بلکہ بیسیوں تھے۔ ظاہر بات ہے کہ سورۃ بقرہ اپنی کامل صورت میں اونٹ کے شانہ کی کسی ایک ہڈی پر تو نہیں سما سکتی، بلکہ کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوگی اور پھر ان مختلف ٹکڑوں میں منسوخ شدہ آیات وسور بھی موجود ہوں گی۔ اب ان مختلف ٹکڑوں اور حصوں کو اگر ترتیب دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف بذریعہ حفظ تھا۔ گویا کتابت اور حفظ دونوں لازم وملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔

اب اگر کبار صحابہ کرامؓ میں سے تمام حفاظ وقرّاء رحلت فرما جاتے تو قرآن کریم کی آیات وسور کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ اور عرضہِ اخیرہ کے مطابق مدون کرنا ایک مشکل امر تھا، حضرت عمرؓ نے اسی خدشہ کو محسوس کیا۔ اسکے ساتھ ساتھ شیخین کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ قرآن کریم جو اب تک مختلف قِسم کے ٹکڑوں اور حصوں میں تحریر تھا اس کو کسی ایک چیز پر اکٹھا لکھ لیا جائے، اس لیے عہدِ صدیقی میں قرآن کریم صرف قرطاس پر لکھا گیا اور دیگر مختلف قسم کی اشیاء کو ترک کر دیا گیا۔

۳۔ حضرت زیدؓ نے تدوین قرآن کے بارِگراں کو اٹھانے کا جو ابتداً انکار کیا تو یہ بات ان کے تقویٰ وورع کی وجہ سے تھی کہ ایسی بھاری ذمہ داری تن تنہا کس طرح اٹھائی جائے، بحیثیت انسان غلطی کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور پھر آئندہ قیامت تک اسی نسخہِ قرآن کریم کو متداول رہنا ہے، انہی احتمالات کے پیش نظر حضرت زیدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے اصرار پر مشروط حامی بھری کہ اس بارِگراں کو میں تنہا نہیں اٹھا سکتا البتہ اگر حضرت عمرؓ کو میرے ساتھ شریک کر دیا جائے تو اس ذمہ داری کو بطریق احسن نبھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دیگر روایات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو بھی اس کام میں شریک کر دیا:

"قال زيد: فقلت: يا خليفة (ابوبكر) رسول الله لو اجتمعت أنا وعمر جميعًا، فقال أبوبكر لعمر: فقال: نعم". (۹)

اسی طرح دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اٹھو اور اِس کام میں حضرت زیدؓ کی مدد کرو:

"قال أبوبكر: قم فكن مع زيد". (۱۰)

اگر مؤرخ احمد بن ابی یعقوب معروف بہ ابن واضح (م۔۲۹۲ھ/۹۰۵ء) کی روایت کو تسلیم کرلیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کارِ عظیم میں پچیس قریشی اور پچاس انصاری افراد نے حصہ لیا:

"قال عمر بن الخطاب لأبى بكر: يا خليفة رسول الله ان حملة القرآن قد قتل أكثرهم يوم اليمامة فلو جمعت القرآن فانى أخاف عليه أن يذهب حملته فقال أبوبكر: أفعل مالم يفعله رسول الله ﷺ، فلم يزل به عمر، حتى جمعه وكتبه فى صحفٍ وكان متفرقاً فى الجريد وغيرها، وأجلس خمسة وعشرين رجلاً من قريش وخمسين رجلاً من الأنصار". (۱۱)

اس بات کی تائید ابوبکر عبداللہ بن ابی داؤد (م۔۳۱۶ھ/۹۲۹ء) کی کتاب المصاحف میں آنے والی روایت میں لفظ "نفر" (یعنی ایک جماعت) سے بھی ہورہی ہے، وہ نقل کرتے ہیں:

"اقعد له نفراً من أصحابه". (۱۲)

اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے تدوین کے لیے باقاعدہ ایک کمیٹی یا کمیشن بنایا گیا۔

۴۔ تدوین کا طریقہ کار کچھ اس طرح سے تھا کہ ابتداً شہر مدینہ میں اس بات کا عام اعلان کروایا گیا کہ جس کسی کے پاس نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں لکھا ہوا کوئی حصہِ قرآن ہو وہ فوراً کمیٹی کو آگاہ کرے:

"جعل مناد ينادى: يا أهل القرآن، فيجيبون المنادى فرادى ومثنى". (۱۳)

"قال عمر: من كان تلقى من رسول الله ﷺ شيئاً من القرآن فليأت به". (۱۴)

اس اعلانِ عام کے بعد جس کسی کے پاس نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں تحریر شدہ کوئی آیت یا سورۃ تھی وہ اسکے ہمراہ مسجد نبوی کی طرف آنے لگا۔ ان آنے والوں میں کسی کے پاس حصہ قرآن کھجور کی شاخ کی ڈنٹھلوں پر اور کسی کے پاس اونٹ کے شانہ کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھا ہوا ہوتا تھا:

"وجعل الناس يأتون بالقرآن، منهم من يأتي به في الصحيفة ومنهم من يأتي به في العسب حتى فرغنا من ذلك". (۱۵)

۵۔ جبکہ اس دوران حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت آنے والے لوگوں سے قرآن مجید کے تحریر شدہ مختلف ٹکڑوں اور حصوں کی وصولی کے لیے مسجد نبوی کے دروازے پر بیٹھ گئے۔

"فخرجنا، حتى جلسنا على باب المسجد". (۱۶)

۶۔ تدوین کے اس اہم کام میں اکابر صحابہ کرامؓ خاص طور پر وہ جو کاتبینِ وحی بھی رہ چکے تھے، جیسے حضرت اُبیؓ بن کعب کو باقاعدہ طور پر بلوایا گیا اور وہ اپنے نسخۂ قرآن کے ساتھ آئے، واضح رہے کہ حضرت زیدؓ کے کاتبِ وحی ہونے سے قبل حضرت اُبی بن کعب کاتبِ وحی رہے تھے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"فأرسلت الىٰ أُبيّ بن كعب فجاء، فوجدنا مع أُبيّ كُتُباً مثل ماوجدنا عند جميع الناس". (۱۷)

تدوینِ قرآن کا مقصد:

عہد صدیقی میں قرآن کریم کی تدوین کا مقصد اور اس کی علت وحکمت کیا تھی؟ اس کے جواب میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے تحریری صورت میں نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو جانے کے خدشہ کے پیش نظر کتابی شکل میں لانا مقصود تھا۔ اگر اس کو علت قرار دے دیا جائے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تردد سمجھ سے بالاتر قرار پاتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت میں تذبذب اور لیت ولعل سے کام کیوں لے رہے تھے؟ اس کام کے لیے تو فوراً احکامات صادر فرما دینے چاہیے تھے۔ اس لحاظ سے اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مابین ہونے والے مکالمہ پر غور کیا جائے تو اس سے جو علت وحکمت سامنے آتی ہے وہ قرآن کا عدم تواتر ہے۔ حضرت عمر کو یہی خدشہ تھا کہ قرآن کریم عدم تواتر کا شکار نہ ہو جائے کیوں کہ اس وقت قرآن کریم کا تواتر اکابر صحابہ کرام سے منسلک ہو کر رہ گیا تھا۔ صغار صحابہ کرام اکابرین ہی کے رہین منت تھے۔ جنگ یمامہ میں اکابر صحابہ کرام کی شہادت سے حضرت عمرؓ کو قرآن کے عدم تواتر کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا۔ وگرنہ قرآن کریم تو عہد نبوی میں تحریری صورت میں موجود تھا اور صحابہ کرام کے ذاتی مصاحف بھی موجود تھے۔

عہد نبوی میں قرآن کریم چوں کہ مدون نہیں تھا اس لیے تحریری صورت میں ہونے کے باوجود قرآن کی عرضہ اخیرہ کے مطابق قرآنیت اکابر صحابہ کرام سے منسلک ہو کر رہ گئی تھی، کیوں کہ عدم تدوین کی وجہ سے قرآنی آیات کی ترتیب، نسخ سے آگاہی اور عرضہ اخیرہ کے ساتھ ساتھ قراءت سے واقفیت اکابرین ہی کا خاصہ بن چکا تھا۔ صغار صحابہ اور دیگر لوگ اسی چشمہ سے سیراب ہو رہے تھے۔ چناں چہ قرآن کو مدون کرنا بذات خود مقصد نہیں بلکہ ایک بڑے مقصد یعنی "تواتر" کے حصول کا

ذریعہ تھا، تاکہ صحابہ کرام کے اس دار فانی سے کوچ کی صورت میں قرآن کے تواتر میں کوئی حرج نہ واقع ہو۔ اور تواتر کا تعلق جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ''حفظ'' سے ہوتا ہے۔ اگر قرآن مکتوب صورت میں تو ہو مگر حفظ نہ ہو تو کیا قرآن کا تواتر قائم رہ سکتا تھا؟ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی مذہبی کتب کی تاریخ کیا اپنے عدم تواتر ہی کی داستان نہیں سنا رہی ہیں؟ بالخصوص تورات و انجیل کے آج مختلف نسخوں کی موجودگی اسی بات کا اظہار نہیں ہے؟ اور کیا قرآن آج اسی امتیازی وصف سے متصف ہونے کی وجہ سے تحریف سے محفوظ نہیں ہے؟

مختصر یہ کہ اس روایت کا اگر تاریخی طور پر جائزہ لیا جائے تو حضرت عمرؓ کو لاحق خدشات کا مقصد مستقبل میں قرآن کریم کا عدم تواتر تھا۔ اس عدم تواتر کے خدشہ کے پیش نظر اکابر صحابہ کرام کے اس اختصاصی و امتیازی وصف میں عمومیت لانا چاہتے تھے تاکہ قرآن کریم ان اکابر صحابہ کرام کے اس دار فانی سے رخصت ہونے کے باوجود قرآن کریم کے تواتر میں کمی کا شکار نہ ہو سکے۔

اسی لیے حضرت عمرؓ کے قول ''فیذهب کثیر من القرآن'' سے عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ قرآن ضائع ہو جانے کا خطرہ تھا جب کہ حقیقت یہ نہیں۔ حضرت عمرؓ کے اس قول سے مراد قرآن کے ضائع ہو جانے کا نہیں بلکہ حاملینِ قرآن کی شہادت کے خدشہ کا اظہار مقصود تھا، جیسا کہ حضرت عمرؓ ہی کے دوسری روایت میں ان الفاظ کی جگہ آنے والے الفاظ ''قبل أن یقتل الباقون'' سے واضح ہوتا ہے (۱۸)، یعنی حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ کی طرح مبادا باقی اکابر قراء صحابہ کہیں باقی نہ رہیں اور پھر فرمایا ''لا یوعیٰ'' (۱۹)، یعنی جب یہ طبقۂ اکابر موجود نہ ہوگا تو قرآن کے حفظ میں کمی آ جائے گی، اور حفظ میں کمی سے عدم تواتر لازم آئے گا۔ جس سے قرآن کریم قطعی الثبوت نہیں رہے گا۔ لفظ ''تواتر'' اپنے اصطلاحی معنی ومفہوم کے اعتبار سے بہت بعد متعارف ہوا مگر یہ معنی حضرت عمرؓ کے الفاظ ''لا یوعیٰ'' میں پایا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے یہی بات مراد لی ہے، چناں چہ وہ شارح صحیح بخاری ابوالحسن علی بن خلف معروف بہ ابن بطالؒ (م ۴۴۹ھ / ۱۰۵۷ء) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پیش نظر اور ان کا تدوینِ قرآن کا مقصد مستقبل میں قرآن کریم کو عدم تواتر کا شکار ہونے سے محفوظ کرنا تھا:

''فلما نبههما عمر علیٰ فائدة ذلک وأنه خشیة أن یتغیر الحال فی المستقبل اذا لم یجمع القرآن فیصیر الیٰ حالة الخفاء بعد الشهرة''. (۲۰)

اس طرح تدوین قرآن کا مقصد قرآن کریم کو پہلی مرتبہ ضبط تحریر میں لانا مقصد نہیں تھا بلکہ اکابر صحابہ کی عدم موجودگی سے مستقبل میں عدم تواتر کا شکار ہونے سے قرآن کو محفوظ کرنا تھا۔ یہی وہ بات ہے جس کو عہد صدیقی میں قرآن کی تدوین کی علت وحکمت قرار دیا جا سکتا ہے۔ (اس موضوع پر آگے مزید بحث کی جائے گی۔)

دو گواہان کی شرط اور اس کی حکمت:

قرآن کی قرآنیت کے اثبات کے لیے کون سا معیار بنایا گیا؟ صرف کتابت معیار تھا؟ کتابت کے ساتھ دو گواہ معیار تھے؟ حفظ یا تواتر معیار تھا اور اس پر کتابت کو پرکھا جاتا تھا؟ یا خود اکابر صحابہ کرام معیار تھے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا ذیل میں جائزہ لیا جائے گا۔

روایات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تحریر شدہ آیات وسور کی وصولی کا یہ اصول طے کیا کہ جب کوئی شخص کمیٹی کے سامنے تحریر شدہ آیات یا سُور پیش کرے تو کمیٹی اس وقت تک وصول نہ کرے جب تک وہ شخص اس پر دو گواہ پیش نہ کر دے:

"فمن جاء کما بشاهدَين علٰی شئ من کتاب الله فاکتباه". (۲۱)

شہاب الدین عبدالرحمٰن بن اسماعیل معروف بہ ابوشامہ مقدسی (م۔۶۶۵ھ/۱۲۶۷ء) نے جو روایت نقل کی ہے اس کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ (م۔۴۵ھ/۶۶۵ء) سے فرمایا تھا کہ جاؤ، مسجد نبوی کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو کوئی تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب کا کوئی حصہ لے کر آئے تو اس کی اس وقت تک تصدیق نہ کرو جب تک دو گواہ نہ طلب کر لو کہ یہ واقعی قرآن ہے اور نبی کریم کے سامنے لکھا گیا ہے:

" فقال أبو بکر لزید: قم فاقعد علیٰ باب المسجد ، فکل مَن جاء کَ بشئ مِن کتاب الله عز و جل تنکره فاطلب منه شاهِدَیْنِ". (۲۲)

ابن سعد کی روایت میں درج بالا بات تثنیہ کے صیغہ میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت زیدؓ دونوں سے فرمایا تھا:

"عن هشام بن عروة عن أبیه قال: اجلسا علی باب المسجد فلا یأتینکما أحد بشئ من القرآن تنکرانه یشهد علیه رجلان الاّ أثبتماه". (۲۳)

اعلانِ عام کا ایک مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے علم میں یہ بات آجائے کہ قرآن مجید کی عرضہ اخیرہ کے مطابق تدوین عمل میں آرہی ہے، اور آئندہ یہی مدون شدہ قرآن مجید آخری اور حتمی ہوگا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ تا کہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں قرآن کے لکھے ہوئے جتنے بھی نسخے لوگوں کے درمیان متداول ہیں ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا جائے اور پھر عرضہِ اخیرہ کے مطابق قرآن مجید مدون کر لیا جائے، اور جو آیات وسور قائم شدہ معیار اور اصول وضوابط پر پوری نہ اتریں اُس حصہِ قرآن مجید کے بارے میں لوگوں میں یہ بات رائج ہو سکے کہ وہ آیات وسور عرضہِ اخیرہ میں منسوخ ہو چکی ہیں۔

اِس اعلانِ عام کے بعد صحابہ کرامؓ کی ایک کثیر تعداد مختلف اشیاء مثلاً ادیم، کتف، عسیب وغیرہ پر لکھے ہوئے اپنے

ذاتی نسخوں کے ہمراہ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے لگے، یہ چونکہ صحابہ کرامؓ کے ذاتی نسخے تھے اس لیے ان میں آیات وسور کی ترتیب بھی ان کی اپنی تھی اور پھران میں منسوخ شدہ حصہ قرآن مجید بھی شامل تھا۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والے مختلف قرآنی نسخوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں لکھے گئے تھے۔ کیونکہ اعلانِ عام میں صرف وہی نسخے لانے کو کہا گیا تھا جو نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں لکھے گئے تھے۔

تدوین کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ منسوخ شدہ حصہِ قرآن مجید سمیت ان تمام نسخوں میں موجود آیات وسور کو مدون کرلیا جاتا، مگر یہ صورت عمل میں نہیں آئی۔ اس کے برعکس کسی آیت یا سورۃ کی شمولیت وعدم شمولیت کا معیار عرضہِ اخیرہ قرار پایا کہ جو آیت یا سورۃ عرضہِ اخیرہ کے مطابق ہوگی وہی لکھی جائے گی۔ اسی بات کے فیصلہ کے لیے کہ کونسی آیت یا سورۃ عرضہِ اخیرہ کے مطابق ہے اور کونسی نہیں دو گواہوں کی شرط عائد کی گئی۔

محدثین نے دو گواہوں کی شرط کی مختلف توجیہات کی ہیں مثلاً شارح صحیح بخاری ابوالحسن علی بن خلف معروف بہ ابن بطالؒ (م۔ ۴۴۹ھ/۱۰۵۷ء) کے نزدیک نصابِ شہادت کی توجیہ کچھ اس طرح ہے کہ پیش ہونے والی آیات وسور کو دونوں (یعنی حضرت عُمر وزید رضی اللہ عنہما) اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک دو گواہ پیش نہ کردیے جائیں، پس وہ دونوں اس بات کی گواہی دیں کہ یہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے سنا ہے۔ تاکہ قرآن کی قرآنیت ثابت ہوجائے اور حفظ پختہ ہوجائے، اس کے ساتھ ساتھ کسی کو انکار کی جرأت نہ رہے:

"وانما أمر أبوبكر عند جمع الصحف عمر بن الخطاب وزيداً بأن يطلبا على من ينكر انه شهادة رجلين فيشهدان سماع ذلک من فيّ النبی ﷺ ليكون ذلک أثبت وأشد فى الاستظهار ومما لا يتسرع أحدٌ الى دفعه وانكاره". (۲۴)

چناں چہ علامہ ابن بطال کے نزدیک قرآن کی قرآنیت کی تصدیق حفظ اور کتابت دونوں ذرائع سے ہورہی تھی۔

علامہ جلال الدین سیوطی اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ دو گواہوں کی شرط سے مراد یہ ہے کہ جو آیات کریمہ قرآن کے طور پر پیش کی جارہی ہیں وہ عرضہ اخیرہ (جس میں نبی کریم ﷺ کی زندگی کے آخری سال ماہِ رمضان المبارک میں آپ ﷺ اور حضرت جبرئیل نے ایک دوسرے کو قرآن کریم سنایا تھا) میں پیش کی جاچکی ہیں اور ان کا تعلق منسوخ شدہ حصہِ قرآن سے نہیں ہے:

"قلت: المراد أنهما يشهد انِ على أن ذلک مما عرض على النبیؐ عام وفاته". (۲۵)

حافظ ابن حجر کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے وہ لکھتے ہیں:

"قال: وكان لا يقبل من أحد شيئا حتى يشهد شاهدان وهذا يدل على أن زيداً كان لايكتفي بمجرد وجد انه مكتوباً حتى يشهد به من تلقاه سماعاً، مع كون زيد كان يحفظه، وكان يفعل ذلك مبالغة في الاحتياط"

اس کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ دو گواہوں سے مراد حفظ اور کتابت ہے یا اس شرط کی یہ بھی توجیہ کی جاسکتی ہے کہ اس بات کی گواہی دی جائے کہ نزول قرآن کی وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے اس کا تعلق ہے، اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ پیش کیا جانے والا قرآن کریم کا تحریر شدہ حصہ محض اپنے حافظہ کی بنا پر نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں لکھے گئے نسخہ کے عین مطابق ہے:

"وكان المراد بالشاهدَين الحفظ والكتاب أو المراد أنهما يشهدانِ على أن ذلك من الوجوه التي نزل بها القرآن وكان غرضهم أن لايكتب الا مِن عين ما كتب بين يد النبيّ لا من مجرد الحفظ". (۲۶)

علامہ سیوطیؒ اور حافظ ابن حجرؒ کے اقوال میں اس طرح تطبیق دی جاسکتی ہے کہ ایک تو اس بات کی شہادت بہم پہنچائی جائے کہ یہ حصہِ قرآن نبی کریم ﷺ کے سامنے لکھا گیا تھا، دوسری شہادت اس بات کی تھی کہ قرآن کریم حفظ سے مطابقت رکھتا ہو، جس کی عرضہِ اخیرہ سے مطابقت کی تصدیق حضرت زیدؓ بن ثابت یا دیگر ارکانِ کمیٹی میں سے صحابہ کرامؓ کرتے تھے۔ اسی طرح یہ دونوں حضرات (تو حضرت عمرؓ اور حضرت زیدؓ) قرآن کے طور پر پیش ہونے والے حصہ کی قرآنیت کا انکار کرتے تو اس پر دو گواہ طلب کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کے الفاظ (فكل مَن جاءک بشيءٍ مِن كتاب الله عز و جل تنكره فاطلب منه شاهِدَيْنِ) سے ظاہر ہو رہا ہے۔

خود حضرت ابو بکر کے الفاظ (تنكره فاطلب منه شاهِدَيْنِ) اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ جو قرآن مدون ہونے جا رہا ہے وہ عرضہِ اخیرہ کے مطابق ہوگا اور منسوخ شدہ حصہ سے مبرا ہوگا وگرنہ یہ بات کمیٹی کے شایانِ شان نہیں ٹھہرتی کہ ان کے سامنے کوئی صحابی آیات کریمہ لایا ہو اور یہ حضرات اس کی قرآنیت سے انکار کر دیں اور نہ ہی کسی صحابی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی غیر قرآن کو قرآن کے طور پر پیش کریں۔ اس طرح کمیٹی کے انکار میں دراصل عرضہ اخیرہ کا اصول پنہاں ہے۔

اب اس کتابت اور حفظ کے اصولوں کے تحت رسمِ قرآن، عرضہِ اخیرہ اور تواترِ قرآن جیسے اہم عناوین شامل ہو جاتے ہیں۔ (آگے چل کر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔)

آیات کی عرضہ اخیرہ کے مطابق قرآنیت کے اثبات کے لیے محض کتابت کو معیار قرار دینے سے اس میں تواتر کی شرائط کیسے پوری ہوسکتی ہیں؟ کیوں کہ پرکھنے کے لیے کہ یہ قرآن کا حصہ ہے یا نہیں صرف دو گواہوں کا نصاب رکھا گیا تھا اور دو گواہوں کی شرط سے تواتر ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن ایک متواتر طریقہ سے روایت کی گئی کتاب ہے اور متواتر کو پرکھنے کے لیے دو گواہوں کی شرط ناکافی قرار پاتی ہے۔ تو پھر حضرت ابوبکر صدیق کی اس شرط کے کیا معنی ہوسکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ تواتر کا کتابت کی نسبت حفظ پر زیادہ دارومدار ہوتا ہے، جب کہ کتابت اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود اس پر زائد چیز ہوتی ہے۔ اس لیے نص قرآنی کا اثبات دلیل قطعی سے ہی ممکن تھا جو کہ تواتر کی صورت یعنی حفظ کی شکل میں موجود تھا، اور اس کی کتابت کا اثبات دلیل ظنی سے کیا گیا۔ اسی لیے شیخ علی بن سلطان محمد القاری معروف بہ ملا علی قاری (م۔۱۰۱۴ھ) لکھتے ہیں کہ حاصل یہ کہ انہوں نے قرآن کریم کی تدوین اور کتابت اسی وقت کی جب ان کے پاس دلیل قطعی سے نصِ قرآنی یعنی قرآن کے لفظ کا اور دلیل ظنی سے اس کی کتابت یعنی رسم کا ثبوت ہوگیا:

"والحاصل انهم ما جمعوا الا بعد ما ثبت بالدليل القطعي لفظه، وبالدليل الظني كتابته". (۲۷)

اس طرح تدوین قرآن میں قرآن کے کسی حصہ یا آیت کی عرضہ اخیرہ کے مطابق قرآنیت ثابت کرنے کے لیے دو گواہوں کی شرط کو صرف اور صرف کتابت سے منسلک کردینا ناکافی بات ہے۔ کتابت کو پرکھنے کے لیے ہمیں حفظ ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے حفظ و کتابت میں حفظ ہی کو اہمیت حاصل ہوجاتی ہے۔ اس طرح آنے والے صحابہ کرام جو تحریری صورت میں آیات اور سورتیں لا رہے تھے ان کو حفظ ہی کے ذریعے پرکھا جا رہا تھا۔ کیوں کہ حفظ ہی میں تواتر، عرضہ اخیرہ اور نسخ کا معاملہ پنہاں تھا۔

اس طرح دو گواہوں (شہادتین) کی یہی توجیہ راجح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد:

الف۔ قرآن کی قرآنیت کی حفظ یعنی تواتر کے ذریعہ تصدیق

ب۔ کتابت کی تصدیق کہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

اس طرح ان دونوں باتوں میں سے حفظ کو معیار ٹھہرایا گیا۔ چناں چہ تدوینِ قرآن کے طریقہ کار کو جب دیکھا جائے تو یہی بات عملی طور پر نظر آتی ہے، چند مثالیں حسب ذیل ہیں، جس سے یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ تدوین کے وقت عرضہ اخیرہ کے اصول کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا اور حفظ کو معیار ٹھہرایا گیا تھا:

مثال نمبرا:

جب حضرت حفصہؓ نے اپنے ذاتی مصحف سے درج ذیل آیت کریمہ کمیشن کے سامنے "وهي صلاة العصر"

کے الفاظ کے اضافہ کے ساتھ (جو اس وقت قرآن کریم کا حصہ نہیں تھے) پیش کی:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى [وهی صلاة العصر]﴾. (۲۸)

حضرت عمرؓ نے تدوین کے طریقہ کار کے مطابق حفظ یعنی تواتر یا عرضہِ اخیرہ سے تصدیق نہ ہونے کی وجہ سے جب حضرت حفصہؓ سے زائد الفاظ پر شہادت طلب کی تو حضرت حفصہؓ ان زائد الفاظ پر کوئی شہادت نہ پیش کر سکیں، جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں بغیر شہادت کے ان زائد الفاظ کو اس مدوّن ہونے والے قرآن میں نہیں لکھوں گا:

"قالت حفصة: اذا انتهيتم الى هذه الآية فأخبرونی، فلما بلغوا اليها ، قالت: اكتبوا: "وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وهی صلاة العصر "فقال عمر أبوها: ألكِ بينة بهذا؟ قالت: لا، قال: فوالله لا ندخل فی القرآن ماتشهد به امرأة بلا اقامة بينة". (۲۹)

اور یہ بات معلوم ہے کہ حضرت حفصہؓ یقیناً غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی تھیں انہوں نے جن الفاظ کا اضافہ کیا وہ منسوخ شدہ حصہ قرآن تھا جبکہ قرآن مجید کی جو تدوین عمل میں آ رہی تھی اس میں صرف عرضہِ اخیرہ کے مطابق قرآن مجید مدون کیا جا رہا تھا اس لیے ان زائد الفاظ کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا گیا۔

درج ذیل روایت سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ حضرت حفصہؓ نے جن الفاظ کا اضافہ کیا تھا وہ زائد الفاظ ان کے خود ساختہ نہیں تھے بلکہ وہ عہدِ نبوی میں قرآن کے طور پر متداول تھے مگر بعد میں عرضہِ اخیرہ میں منسوخ ہو گئے تھے، جیسا کہ درج ذیل روایت سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ وہ عہدِ نبوی میں منسوخ ہو چکے تھے:

"عن البراء بن عازب قال: نزلت هذه الآية ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ [و صلاة العصر]﴾ فقرأناها على رسول الله ﷺ ما شاء الله ثم نسخها الله عزوجل فأنزل ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾، فقال له رجلٌ، لی اذن صلاة العصر؟ قال البراء: قد حدثتك كيف نزلت و كيف نسختها عزوجل". (۳۰)

"حضرت براءؓ بن عازب سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب یہ آیت ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ [وصلاة العصر]﴾ نازل ہوئی تو ہم اس آیت کو نبی کریم ﷺ کے سامنے پڑھا کرتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو منسوخ کر دیا اور یہ آیت نازل فرمائی: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ تو اس پر محفل میں موجود کسی شخص نے کہا کہ اب تو صلاۃ وسطیٰ یہی نمازِ عصر ہے تو حضرت براءؓ بن عازب نے کہا میں تو تم کو بتلا چکا ہوں کہ یہ کیونکر نازل ہوئی اور کیونکر اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا۔"

مثال نمبر۲:

حضرت عمرؓ نے جب آیتِ رجم کمیٹی کے سامنے پیش کی تو حضرت زیدؓ نے آیتِ رجم کو نہ لکھا کیونکہ حضرت عمرؓ شہادت بہم نہ پہنچا سکے:

"وأن عمر أتى بآية الرجم فلم يكتبها لأنه كان وحده". (۳۱)

اس طرح حضرت عمرؓ کی پیش کردہ آیت کریمہ بھی مطلوبہ معیار پر پوری نہ اُتر سکی، کیوں کہ اس کی حفظ یعنی تواتر کے ذریعے تصدیق نہیں ہوسکی۔

مثال نمبر۳:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب تشریف لائے تو انہوں نے سورۃ العصر کی ابتدائی دو آیات کے بعد منسوخ شدہ الفاظ (وانه فيه الىٰ آخر الدهر) لکھنے کو کہا تو حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ ان غیر فصیح الفاظ کو ہم سے دور کیجیے یعنی ان الفاظ کا عرضہ اخیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس طرح کمیٹی نے الفاظ شامل نہیں کیے:

"وقال ابن مسعود: اكتبوا ﴿وَالْعَصْرِ. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ﴾ (۱۰۳:۱،۲) وانه فيه الىٰ آخر الدهر، فقال عمر: نحوّا عنا هذه الأعرابية". (۳۲)

اور یہ بات پہلے کہی جاچکی ہے کہ عرضہ اخیرہ میں حضرت زیدؓ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی موجود تھے، اور وہ قرآن میں ہونے والے نسخ اور تبدیلی سے آگاہ تھے۔جیسا کہ ابن ابی شیبہ نقل کرتے ہیں:

"عن ابن عباس: أن رسول الله ﷺ كان يعرض القرآن فى كل رمضان مرة إلا العام الذى قبض فيه فانه عرض عليه مرتين بحضرة عبدالله بن مسعود فشهد مانسخ منه ومابدل." (۳۳)

اس لحاظ سے وہ عرضہِ اخیرہ سے یقیناً آگاہ تھے مگر اس کے باوجود اُن کا ان الفاظ کو پیش کرنا منسوخ وغیر منسوخ آیات کو ایک مرحلہ سے گزارنا مقصود تھا۔

نتائج بحث:

درج بالا بیان کی گئیں مثالوں سے جو اصول سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

☆ ان دونوں مثالوں سے درج بالا اصول (حفظ و کتابت) کی تصدیق ہوتی ہے اور حفظ کی کتابت پر فوقیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

☆ اکابر صحابہ کرام حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عمرؓ حفظ ہی کے ذریعے اس کی تصدیق کررہے تھے۔

☆ جن آیات کو کمیٹی لینے سے انکار کر رہی تھی اس کی وجہ ان کا منسوخ ہونا تھا اور اس کے نسخ کا معلوم ہونا عرضہِ اخیرہ سے معلوم ہو رہا تھا، جب کہ عرضہِ اخیرہ سے آگاہی حفظ یعنی تواتر ہی کے ذریعے ممکن تھی۔

☆ اس کے ساتھ ساتھ لوگ جو تحریری صورت میں لا رہے تھے اس سے رسمِ قرآنی کی توثیق بھی ہو رہی تھی۔

اسی طرح حضرت اُبیؓ بن کعب بھی اپنے مصحف کے ساتھ کمیٹی کے پاس آئے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے مروی روایت گزشتہ صفحات پر نقل کی گئی ہے کہ:

"قال عمر: فأرسلت الى أُبَیّ بن کعب وجاء، فوجدنا مع أُبَیّ کتباً مثل ماوجدنا عند جمیع الناس"۔

"حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے حضرت اُبیؓ بن کعبؓ کو بلوایا جب وہ آئے تو ان کے پاس قرآن مجید کے لکھے ہوئے کتبات تھے جیسا کہ آنے والے تمام لوگوں کے پاس تھے۔"

مگر حضرت اُبیؓ بن کعبؓ کے مصحف میں روایات کے مطابق ایسی آیات والفاظ بھی تھے جن کو قرآن کے مدون ہونے والے نسخے میں شامل نہیں کیا گیا۔ مثلاً درج ذیل آیت میں "متتابعات فی کفارۃ الیمین" کے الفاظ زائد ہیں۔

﴿فصیام ثلاثة أیام [متتابعات فی کفارة الیمین]﴾(۳۴)

اسی طرح دیگر مصاحفِ صحابہ میں منسوخ شدہ آیات وسور موجود تھیں مگر ان کو کمیشن نے قبول نہیں کیا۔ کیونکہ کمیٹی نے یہ طریقہ کار وضع کیا تھا کہ مکتوب شکل میں پیش ہونے والی ہر آیت یا سورۃ نصابِ شہادت پر جانچنے کے بعد قبول کی جائے گی اور صرف ان آیات وسورتوں کو شامل کیا جائے گا جو عرضہِ اخیرہ کے مطابق ہوں گی۔

☆ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا حضرت عمرؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے کبار صحابہ اور صحابیہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم جو آیات کمیٹی کے سامنے تدوین کے لیے پیش کر رہے ہیں وہ منسوخ ہو چکی ہیں؟ اس بات کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ کمیٹی کی طرف سے تدوین کا جو طریقہ کار وضع کیا گیا تھا اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ صحابہ کرامؓ کے جمع ہونے والے مصاحف کی ہر آیت یا سورۃ کو باقاعدہ ایک عمل (Process) کے ذریعے تدوین کے مختلف مراحل سے گزارا جائے خواہ اس آیت یا سورۃ کا تعلق عرضہ اخیرہ سے ہو یا نہ ہو۔

مصاحفِ صحابہ کرام کو مختلف مراحل سے گزارنے میں یہ حکمت تھی کہ جن صغار صحابہ کرامؓ اور دیگر لوگوں کے علم میں یہ بات نہیں کہ قرآن مجید کی فلاں آیت یا سورۃ منسوخ ہوگئی اور فلاں کی تلاوت باقی ہے وہ اس سے آگاہ ہو جائیں، اور یہ بات اس وقت کے معاشرہ میں معروف ومشہور ہو جائے۔

اگر قرآن کریم کو نسخ وبدل کی خصوصیت کے ساتھ مدوّن کیا جاتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ قرآن کریم آج

موجودہ قرآن سے بھی ضخیم ہوتا، اور مسلمان اس کو اونٹوں پر اٹھا کر پھر رہے ہوتے۔ اس کے ساتھ ساتھ دین میں اختلاف اور اختلاط کا بھی پیدا ہو جانا یقینی امر تھا۔ جیسا کہ علامہ ابو سلیمان حمد بن محمد خطابی (م۔۳۸۸ھ/۹۹۸ء) ان خدشات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

''فلو كان قد جمع بين الدفتين كله ،وسارت به الركبان وتناقلته الأيدى فى البقاع والبلدان،ثم قد نسخ بعضه ورفعت تلاوته لأدى ذلك الى اختلاف أمر الدين ووجود الزيادة والنقصان فيه وأوشك أن تنتقض به الدعوة وتتفرق فيه الكلمة وأن يجدالملحدون السبيل الى الطعن عليه والتشكيك فيه''. (۳۵)

ایسے ہی خدشات کا اظہار علامہ حسین بن مسعود بغوی (م۔۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء) ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''فثبت أن القرآن كان علىٰ هذا التاليفِ والجمعِ فى زمان النبى ﷺ ويُشْبِهُ أن يكون النبى ﷺ انما ترك جمعه فى مصحف واحد،لأن النسخ كان يَرِدُ على بعضه،ويُرفعُ الشئ بعد الشئ من تلاوته،كما يُنسخ بعض أحكامه، فلو جمعه، ثم رُفعت تلاوةُ بعضه أدى ذلك الى الاختلاف،واختلاط أمر الدين، فحفظه اللّٰه فى القلوب الىٰ انقضاء زمانِ النسخ، ثم وفَّقَ لجمعه الخلفاء الراشدين''۔(۳۶)

ابوشامہ (م۔۶۶۵ھ) کا بھی یہی مؤقف ہے وہ لکھتے ہیں:

'' انما لم يجمعه ﷺ فى مصحف واحد ، لما كان يعلم من جواز ورود النسخ علىٰ أحكامه ورسومه ، فلما ختم الله دينه بوفاة نبيه ﷺ ، وانقطع الوحى، قيض لخلفاء الراشدين عند الحاجة اليه جمعه بين الدفتين ''. (۳۷)

ابن حجر (م۔۸۵۲ھ) کا تائیدی مؤقف پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔(۳۸)

تدوینِ قرآن اور سبعہ احرف؟

روایت تدوین قرآن پر جب بحث کی جاتی ہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے الفاظ ''صدور الرجال'' سے سبعہ احرف مراد لے لیا جاتا ہے، جیسا کہ ذیل کی بحث میں یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ حضرت زیدؓ قرآن مجید کو سبعہ احرف کی رعایت کے ساتھ جمع کرنا چاہتے تھے، اور قرآن کریم کو قراءاتِ سبعہ کی رعایت کے ساتھ لکھنے کے لیے حفاظِ قرآن کریم کی ضرورت تھی۔ حضرت زیدؓ نے انہیں وجوہات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''صدور الرجال'' کی بات کی تھی۔ شیخ علم الدین ابوالحسن علی بن محمد سخاوی (م۔۶۴۳ھ/۱۲۴۶ء) لکھتے ہیں:

”وأما قوله’صدور الرجال‘: فانه كتب الوجوه السبعة التى نزل بها القرآن.فكان يتتبّعها من ’صدور الرجال‘ ليحيط بها علماً“. (۳۹)

حضرت زیدؓ کے الفاظِ روایت ’’فتتبّعتُ القرآن‘‘ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں کہ حضرت زیدؓ قراءات و وجوہاتِ قرآنیہ کو تلاش کررہے تھے:

”فما معنى هذا التتبع والطلب لشيئ انما هو ليحفظه ويعلمه ،أجيب: أنه كان يتتبع وجوهه وقراءاته ويسأل عنها غيره ليحيط بالأحرف السبعة التى نزل بها الكتاب العزيز،ويعلم القراء ات التى هي غير قراء اته“. (۴۰)

حالاں کہ حضرت زید بن ثابتؓ کے ان الفاظ کا سبعہ احرف کی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔(جس پر مزید بحث جمع قرآن بعہد عثمانی میں کی جائے گی۔) حضرت زیدؓ کے الفاظ سے ’’حفظ‘‘ ہی مراد ہے، لہٰذا حضرت زیدؓ کے الفاظ کے ظاہری معانی ہی حقیقی معنی ہیں۔یعنی ’’وصدور الرجال‘‘ کا مفہوم ’’مع صدور الرجال‘‘ ہے، جس کا مطلب ہے کہ ’’حفظ‘‘ کے ساتھ اور حفظ کو معیار بنا کر قرآن مدون کیا۔حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہاں ’’واؤ‘‘ تفسیری یا مغایرت کا نہیں بلکہ ’’واؤ‘‘ ’’معیت‘‘ کا معنی لیے ہوئے ہے:

”الواو بمعنى مع أى أكتبه من المكتوب الموافق للمحفوظ“. (۴۱)

عہدِ صدیقی میں قرآن کس پر لکھا گیا؟

تدوینِ قرآن کے وقت قرآن مجید کس چیز پر لکھا گیا؟ روایات کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عہد صدیقی میں قرآن مجید قرطاس پر لکھا گیا۔

عرب معاشرہ میں قرطاس سے مراد عام طور پر ’’ورق بردی‘‘ یا پاپَرس (Papyrus) لیا جاتا تھا۔عمارہ بن غزیہ سے منقول ہے وہ حضرت زید بن ثابتؓ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ عہدِ صدیقی میں قرآن مجید جلدِ قسم کی اشیا، شانوں کی ہڈیوں اور کھجور کی شاخوں کے ڈنٹھلوں پر لکھا گیا:

”عن عمارة بن غزية ...... عن زيد بن ثابت قال: فأمرنى فكتبته فى قطع الأدم وكسر الأكتاف والعسب“. (۴۲)

یہ روایت چونکہ دیگر صحیح روایات سے متعارض ہے اس لیے اس بات کو تدوینِ قرآن سے قبل قرآن کی حالت پر محمول کیا جائے گا۔کیونکہ اگر عہدِ صدیقی میں بھی قرآن مجید جلد قسم کی اشیا اور شانوں کی ہڈیوں وغیرہ پر تحریر کیا جاتا تو پھر قرآن مجید کی عہد نبوی میں جو کیفیت تھی اور موجودہ کیفیت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔چنانچہ ابن حجر اس روایت کے جواب میں لکھتے ہیں:

"وانما كان فى الأديم والعسب أوّلاً قبل أن يجمع فى عهد أبى بكر ثم جمع فى الصحف فى عهد ابى بكر كما دلت عليه الأخبار الصحيحة المترادفة".(۴۳)

بعض روایات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عہدِ صدیقی میں قرآن کریم قراطیس پر لکھا گیا:

"عن خارجة أن أبابكر الصديق رضى الله عنه كان جمع القرآن فى قراطيس"۔(۴۴)

قراطیس مصحف کی شکل میں نہیں بلکہ صحف کی صورت میں تھے۔ گویا کہ تدوینِ قرآن کریم کے وقت بقدرِ طوالت ایک یا کئی سورتیں ایک صحیفہ میں لکھ دی جاتی تھیں، اس طرح کئی صحف تیار ہوئے۔ ابوشامہ لکھتے ہیں:

"وكأن أبابكر رضى الله عنه كان جمع كل سورة أو سورتين أو أكثر من ذلك فى صحيفة على قدر طول السورة وقصرها"۔(۴۵)

محدث بیہقیؒ حضرت زیدؓ بن ثابت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ عہدِ نبوی میں قرآن مجید کی نازل ہونے والی آیات کو دیگر آیات کے ساتھ ان کے محل ومقام پر رکھا کرتے تھے، جبکہ عہدِ صدیقی میں قرآن کریم کو صحف میں مدّون کیا گیا اور پھر عہدِ عثمانی میں ایک مصحف میں مرتب کیا گیا:

"قال البيهقى:........ قد روينا عن زيد بن ثابت أن التأليف كان فى زمن النبى ﷺ، وروينا عنه أن الجمع فى الصحف كان فى زمن أبى بكر، والنسخ فى المصاحف كان فى زمن عثمان". (۴۶)

صُحف اور مصحف میں فرق:

عہدِ نبوی میں پورا قرآن آج کے دور میں متداول کاغذ کے اوراق پر نہیں بلکہ دباغت شدہ چمڑے، اونٹ کی پسلیوں اور پتھر کی تختیوں وغیرہ پر لکھا گیا تھا۔ موجودہ دور میں متداول قرآن کا ایک صفحہ اگر پتھر کی ایک تختی پر لکھا جاتا ہوتو اس طرح کم وبیش پانچ سو سے چھ سو تک ٹکڑے بن سکتے ہیں۔ ان مختلف اقسام پر تحریر شدہ ٹکڑے دو یا چار نہیں بلکہ کافی تعداد میں ہوں گے، اور پھر ان کتابات کو سنبھالنا، ترتیب دینا اور کانٹ چھانٹ کرنا ایک محنت طلب کام تھا، جو سرکاری سطح پر تو ممکن ہے، جیسا کہ حضرت زیدؓ اور دیگر کاتبینِ وحی یہ فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ البتہ ایک فرد کے لیے یہ کام ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا۔ شاید اسی لیے قرآن مجید کی کتابت کی نسبت حفظ قرآن کے فضائل اور ترغیب سے متعلق کتبِ احادیث میں کثیر روایات پائی جاتی ہیں، اور پھر خود اہلِ عرب جہاں اپنے حافظہ میں ضرب المثل تھے وہاں ان میں چیزوں کو حفظ کر لینے کی بھی عادت تھی۔ عربوں کی اس عادت سے بھی قرآن کو محفوظ رکھنے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔

علامہ سیوطی علامہ ابن التین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کریم کو صحیفوں میں اس ترتیب

سے مدوّن کر دیا کہ ہر ایک سورت اور آیت نبی کریم ﷺ کے بیان کے مطابق یکے بعد دیگرے درج کر دیں اور حضرت عثمانؓ نے عہدِ صدیقی میں مدون ہونے والے صحف کو ایک ہی مصحف میں سورتوں کی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا:

"فجمعه [أبوبكر] فی صحائف مرتباً لآيات سوره علی ماوقفهم عليه النبی ﷺ......

فنسخ...... تلك الصحف فی مصحف واحد مرتباً لسوره"۔(۴۷)

اسی طرح حافظ ابن حجر "صحف" اور "مصحف" کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "صحف" اور "مصحف" میں فرق یہ ہے کہ "صحف" ان مجرد اوراق کو کہتے ہیں جن پر عہدِ صدیقی میں قرآن مدون کیا گیا۔ اس دوران ہر سورت میں آیات ترتیبِ توقیفی کے مطابق رکھی گئی تھیں۔ لیکن ہر سورت کو ترتیبِ توقیفی کے مطابق دوسری سورت کے ساتھ مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ عہدِ عثمانی میں جب سورتوں کو بھی ترتیبِ توقیفی کے مطابق مرتب کر دیا گیا تو یہ مرتب شدہ قرآن "مصحف" بن گیا:

"والفرق بين الصحف والمصحف، أن الصحف الأوراق المجردة التی جمع فيها القرآن فی عهد أبی بكر. وكانت سوراً مفرقة كل سورة مرتبة بآياتها علی حدة لكن لم يرتب بعضها اثر بعض، فلما نسخت ورتب بعضها اثر بعض صارت مصحفاً". (۴۸)

ابن سِیدہ (م۔۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء) لکھتے ہیں:

"المصحف، الجامع للصحف المكتوبة بين الدفتين كأنه أصحف أی جمعت فيه الصحف". (۴۹)

حضرت علیؓ سے مروی جو روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو دو گتوں کے درمیان جمع کیا:

"أبو بكر أوّل من جمع القرآن بين اللوحين"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن مجید مصحف کی شکل میں مدون کروایا تھا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن مجید مدون کروایا جو اَب یعنی حضرت ابوبکرؓ کے بعد والے زمانے میں دو گتوں کے درمیان موجود ہے۔ ابوشامہ لکھتے ہیں:

"أبو بكر أول من جمع القرآن [الذی هو الآن] بين اللوحين". (۵۰)

صحابہ کرامؓ کے ذاتی نسخوں کو بھی عام طور پر "مصحف" کہہ دیا جاتا ہے، مگر یہ مصاحف دراصل اصطلاحاً جس کو مصحف کہا جاتا ہے وہ نہیں تھے بلکہ وہ چونکہ صورۃً مصحف سے ملتے جلتے تھے اس لیے ان کو بھی مصحف کہہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ "مصحف" کا اطلاق تو اس پر بھی کر دیا جاتا ہے جو مکمل قرآن نہ بھی ہو۔ جیسا کہ مصحفِ اُبیؓ بن کعبؓ میں ایک سو پانچ

سورتیں تھیں، اور مصحفِ عبداللہؓ بن مسعود میں ایک سو آٹھ سورتیں تھیں ۔مگر اس کے باوجود ان کو ''مصحف'' ہی کہا گیا۔

صحفِ صدیقی اور صحیفۂ امام:

عہدِ صدیقی میں جو قرآن مجید مدوّن ہوا وہ حضرت ابوبکرؓ کا ذاتی نسخہ نہیں تھا بلکہ باقاعدہ سرکاری طور پر اکابر صحابہ کرامؓ کے اتفاق سے صحف کی شکل میں مدوّن شدہ ایک قرآن تھا، اور اس قرآن کی حیثیت نسخہ امام (Master Copy) کی تھی کہ ضرورت کے وقت جس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ تاریخ میں اس کو ''النسخة الأم'' یعنی ''نسخہ امام'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عہدِ صدیقی میں قرآن مجید ضایع ہو جانے کے خدشہ کے سبب جب قرآن مدون کروانا چاہا تو ان کے پیش نظر یہی بات تھی کہ ایک نسخہ امام (Master Copy) حفاظ وقراء صحابہ کی موجودگی میں عرضہ اخیرہ کے مطابق مرتب ہو جائے تاکہ حفاظ وقراء صحابہ کی عدم موجودگی کی صورت میں قرآن مجید محفوظ رہ سکے، اور اختلاف کی صورت میں اس کی طرف رجوع کیا جا سکے، جیسا کہ عہدِ عثمانی میں ہوا اور یہی صحفِ صدیقی کام آئے:

''لما أراد عمر أن يكتب الامام أقعد له نفراً من أصحابه ''.(۵۱)

اسی لیے حضرت علیؓ ان صحف کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ کی کتاب یعنی قرآن کریم کو اس طرح مدون کروایا کہ وہ ''نسخہ امام'' یا ماسٹر کاپی بن گیا:

''عن عبد خير قال: سمعت علياً يقول أعظم الناس فى المصاحف أجراً أبوبكر، رحمه الله علٰى أبى بكر هو أوّل من جمع كتاب الله واماماً''۔(۵۲)

اسی طرح حضرت عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں عہدِ صدیقی میں مدوّن شدہ قرآن سے جو مصاحف تیار کروا کے مختلف صوبوں میں بھیجے تھے ان کو بھی متعلقہ صوبوں میں صحف صدیقی کی نسبت سے نسخہ امام (Master Copy) کی حیثیت حاصل تھی کہ جس کو سامنے رکھ کر مزید مصاحف تیار کیے جا سکیں اور اختلاف کی صورت میں اس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں:

''فبلغ ذلك [خبر اختلاف الناس فى القرآن] عثمان، فقام خطيباً فقال: اجتمعوا يا أصحاب محمد واكتبوا للناس اماماً''(۵۳)

اس طرح عہد صدیقی میں جو نسخہ قرآن تیار ہوا، وہ صحابہ کرام کے نزدیک متفق علیہ تھا، سرکاری طور پر تیار کیا ہوا نسخہ بھی یہی تھا اور امت کی رہنمائی کا باعث بھی یہی بنا۔

باقی آئندہ------

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، مصطفیٰ البابی الحلبی ،مصر، ج ا،ص ۶۰، فصل :۱۸: فی جمعہ وترتیبہ۔

۲۔ ابن حجر، فتح الباری، کتاب: فضائل القرآن، باب: جمع القرآن، دارالمعرفہ، بیروت، (س۔ن)، ج ۹،ص ۱۲۔

۳۔ سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، نوع ۱۸، ج ا، ص ۵۷۔

۴۔ ابن حجر، فتح الباری، کتاب: فضائل القرآن، باب: جمع القرآن، دارالمعرفہ، بیروت، (س۔ن)، ج ۹، ص ۱۲۔مزید: ابوشامہ ابوشامہ، شہاب الدین عبدالرحمٰن بن اسماعیل بن ابراہیم، المرشد الوجیز الیٰ علوم تتعلق با لکتاب العزیز، تحقیق: طیار آلتی قولاج، دار وقف الدیانہ، انقرہ، ترکی، طبعہ ثانیہ، ۱۹۸۶ء، ص ۶۲۔

۵۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، جامع صحیح، کتاب: فضائل القرآن، باب: جمع القرآن۔☆ کتاب التوحید (باب: ﴿و كان عرشه على الماء..........﴾ ☆ کتاب الاحکام (باب: يستحب للكاتب أن يكون أميناً عاقلاً) ☆ کتاب التفسیر (باب: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ....رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾.

۶۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، جامع صحیح، ترجمہ: مولانا امجد العلی ودیگر علمائے کرام، کتاب: فضائل القرآن، باب: جمع القرآن، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۲۰۰۳ء۔ج ۲،ص ۱۱۷۳۔

۷۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، تحت تذکرہ: زید بن ثابت، ج ۲، ص ۱۱۲۔

۸۔ ابن ابی شیبہ، الکتاب المصنف فی الأحادیث، ج ۶،ص ۵۳، دارلکتب العلمیہ، بیروت۔

۹۔ ابوشامہ، شہاب الدین عبدالرحمٰن بن اسماعیل بن ابراہیم، المرشد الوجیز الیٰ علوم تتعلق با لکتاب العزیز، تحقیق: طیار آلتی قولاج، دار وقف الدیانہ، انقرہ، ترکی، طبعہ ثانیہ، ۱۹۸۶ء، ص ۶۲، ۶۳۔

۱۰۔ ابوشامہ، المرشد الوجیز، ص ۶۳۔

۱۱۔ ابن واضح، احمد بن أبی یعقوب، تاریخ الیعقوبی، مطبعۃ الغری النجف، ایران، ۱۳۵۸ھ، ج ۲، ص ۱۱۳۔

۱۲۔ ابن ابی داود، ابوبکر عبداللہ، کتاب المصاحف، تحقیق: آرتھر جیفری، مطبعہ رحمانیہ، مصر، طبع اول، ۱۹۳۶ء، ص ۱۱۔

۱۳۔ ابوشامہ، المرشد الوجیز، ص ۶۳۔

۱۴۔ ابن حجر، عسقلانی، فتح الباری، ج ۹، ص ۱۴۔

۱۵۔ ابوشامہ، المرشد الوجیز، ص ۶۳۔

۱۶۔ ابوشامہ، المرشد الوجیز، ص ۶۳۔

۱۷۔ ابوشامہ، المرشد الوجیز، ص ۶۳۔

۱۸۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: وفى رواية شعيب : قبل أن يقتل الباقون"۔ ابن حجر، فتح الباری، کتاب: فضائل القرآن، باب: جمع القرآن، دارالمعرفہ، بیروت، (س۔ن)، ج ۹، ص ۱۲۔

۱۹ حدثنا هارون بن كامل المصرى ثنا عبدالله بن صالح حدثنى الليث حدثنى يونس عن ابن شهاب أخبرنى ابن السباق أن زيد بن ثابت قال: ......فيذهب كثير من القرآن لا يوعى!۔ طبرانی، حافظ ابوقاسم سلیمان بن احمد (م ۳۶۰ھ)

المعجم الکبیر ،تحقیق وتخریج:حمدی عبدالمجید السلفی،طبعہ ثانیہ،ج۵ص۱۴۶۔۱۴۷،روایت نمبر:۴۹۰۱،۴۹۰۲۔

۲۰۔ ابن حجر،فتح الباری،کتاب:فضائل القرآن،باب:جمع القرآن،ج۱۰ص۱۶۔

۲۱۔ ابوشامہ،المرشدالوجیز،ص۶۳۔

۲۲۔ ابوشامہ،المرشدالوجیز،ص۶۳۔

۲۳۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد بحوالہ کنز العمال،علی متقی ہندی،روایت نمبر:۴۷۵۳۔

۲۴۔ ابن بطال،شرح صحیح البخاری،ج۵ص۲۳۔۲۴۔

۲۵۔ سیوطی،جلال الدین،الاتقان فی علوم القرآن ج۱ص۶۰،طبعہ اولیٰ،مطبعہ ازھریہ،مصر۔۱۳۱۸ھ۔

۲۶۔ ابن حجر،فتح الباری،ج۱۰ص۱۷۔

۲۷۔ ملاعلی قاری،علی بن سلطان محمد القاری،مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح،ج۲ص۶۲۸۔

۲۸۔ سورۃ البقرۃ:۲۳۸۔

۲۹۔ سیوطی،جلال الدین،الدرّ المنثور،ج۱ص۳۰۲،۳۰۳۔

۳۰۔ مسلم محمد بن صحیح،کتاب:الصلوۃ،باب:دلیل مَن قال الصلوۃ الوسطی ھی صلاۃ العصر،دارالفکر بیروت،ج۵ص۱۳۱۔

۳۱۔ سیوطی،الاتقان،ج۱ص۶۰۔

۳۲۔ ابن الانباری،کتاب المصاحف،بحوالہ علی متقی ہندی،کنز العمال،کتاب الاذکار،روایت نمبر۴۷۵۹،ج۱ص۲۴۴،دارالکتب العلمیہ،بیروت،۱۹۹۸ء۔

۳۳۔ ابن ابی شیبہ،کتاب المصنف،کتاب فضائل القرآن،

۳۴۔ اسی طرح کی مزید روایات کتاب المصاحف(ابن ابی داود)اور دیگر کتب میں موجود ہیں دیکھو:ابن ابی داود،کتاب المصاحف،ص۵۳۔

۳۵۔ خطابی،ابوسلیمان حمد بن محمد،أعلام السنن فی شرح صحیح البخاری،ج۲،۳۳۸۔

۳۶۔ بغوی،حسین بن فراء،شرح السنۃ،باب:جمع القرآن،ج۳ص۵۰،دارالکتب العلمیہ،بیروت،۲۰۰۳ء۔

۳۷۔ ابوشامہ،المرشدالوجیز،ص۶۲۔

۳۸۔ ابن حجر،فتح الباری،کتاب:فضائل القرآن،باب:جمع القرآن،دارالمعرفہ،بیروت،(س۔ن)،ج۹ص۱۲۔

۳۹۔ سخاوی،ابوالحسن،علم الدین،جمال القرّاء وکمال الاقراء،تحقیق:ڈاکٹر عبدالکریم الزُبیدی،دارالبلاغہ،بیروت طبع اول،۱۹۹۳ء،ج۱،ص۲۴۔

۴۰۔ عینی،بدرالدین،عمدۃ القاری،ج۱۸ص۳۸۲،کتاب:التفسیر،باب:سورۃ التوبۃ۔

۴۱۔ ابن حجر،فتح الباری،کتاب:فضائل القرآن،باب:جمع القرآن،دارالمعرفہ،بیروت،ج۹ص۱۵۔

۴۲۔ طبری،محمد بن جریر،جامع البیان،ج۱ص۵۹۔

۴۳۔ ابن حجر،فتح الباری،کتاب:فضائل القرآن،باب:جمع القرآن،دارالمعرفہ،بیروت،ج۹ص۱۲۔

۴۴۔ ابوشامہ، المرشد الوجیز، ص۷۵۔

۴۵۔ ابوشامہ، المرشد الوجیز، ص۵۹۔

۴۶۔ سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج۱، ص۶۱۔

۴۷۔ سیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج۱، ص۶۱۔

۴۸۔ ابن حجر، فتح الباری، ج۹، ص۱۵۔

۴۹۔ ابن سیدہ، علی بن اسماعیل نحوی (م-۴۵۸ھ)، المخصص، ناشر، دار الآفاق الجدیدہ، بیروت، ج۴، ص۸۔

۵۰۔ ابوشامہ، المرشد الوجیز، ص۷۵۔

۵۱۔ ابن ابی داؤد، کتاب المصاحف، ص۱۱۔

۵۲۔ ابن حجر، فتح الباری، ج۹، ص۹۔

۵۳۔ ابن ابی داود، کتاب المصاحف، ص۲۱۔